اعضاء کی پیوند کاری اور احترامِ آدمیت

ڈاکٹر محمد فوزی فیض اللہ

ترجمہ و تلخیص عبدالمنان محمد شفیق

انسانی اعضاء (جیسے گردہ، آنکھ وغیرہ) کی پیوند کاری کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں اہلِ علم کے متعدد مضامین جرائد و مجلّات میں شائع ہوتے رہتے ہیں جن میں سے بعض جزوی اور مشروط طور پر اس عمل کو جائز قرار دیتے ہیں تو بعض غیر مشروط اور کلی طور پر جبکہ ایک طبقہ اسے کلیۃً حرام قرار دیتا ہے۔ آج ہم ایک عرب ڈاکٹر جناب محمد فوزی فیض اللہ کا ایک مضمون نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں کوئی دوسرا موقف موصول ہوا تو اسے بھی پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ۔ (مجلسِ ادارت)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

ولقد کرمنا بنی آدم	یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم
وحملناھم فی البر والبحر	کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں
ورزقناھم من الطیبات	عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے
وفضلناھم علی کثیر ممن خلقنا	رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر
تفضیلا (الاسراء/۷۰)	نمایاں فوقیت بخشی۔

انسان کی تکریم کا سبب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس کی تخلیق خود اپنے ہاتھوں سے کی اور اسے ایک متناسب اور اچھی شکل و صورت عطا کی۔ آنکھ، کان، ناک اور دوسری صلاحیتوں سے بہرہ ور فرمایا اور عقل جیسی نعمت، علم جیسی دولت اور گویائی جیسی صلاحیت سے نواز کر اسے دنیا کی تمام مخلوقات پر فضیلت و برتری عطا فرمائی اور اس کی فطرت میں گوناگوں صلاحیتیں ودیعت فرمائیں، فرشتوں کو اس کے آگے سربسجود ہونے کا حکم دیا، کائنات کو اس کے تابع بنایا، زمین میں اسے اپنا نائب و خلیفہ مقرر کیا اور اپنے دین کی اشاعت، شریعت

علم و فن میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا کوئی ثانی نہیں : (محدث ابوزرعہ)

کی تبلیغ اور احکام کی بجا آوری اس کے ذمہ ڈالی۔

اس تکریم کا تقاضہ یہ ہے کہ نسل انسانی کی حفاظت وبقا کی کوشش کی جائے اس کے لیے صرف صحیح اور شرعی طریقہ ہی اپنایا جائے اور دیگر تمام طریقوں سے بچا جائے اور ساتھ ہی ان تمام وسائل و ذرائع سے مکمل احتراز کیا جائے جو ایک طرف اس کے لیے تکلیف دہ یا اس کی کمزوری کا باعث ہیں اور دوسری طرف اس کو موت یا اس کے اعضاء میں قطع و برید تک لے جانے والی ہیں کیونکہ نفسِ انسانی کا ناحق قتل کسی بھی صورت میں جائز نہیں ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان	اے مسلمانو! تم (خود سے) اپنی جانوں کو
بکم رحیما (النساء:۲۹)	ہلاک مت کرو بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے

اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خودکشی کرنے یا ایک دوسرے کو قتل کرنے سے روک دیا ہے اور ان تمام چیزوں سے دور رہنے کا حکم دیا ہے جو قتل اور ہلاکت کا موجب ہیں مثلاً ہیروئن، اسمیک اور دیگر نشہ آور ادویات اور انسانی جسم کے لیے نقصان دہ زہروں کا استعمال اور اس قبیل کی دیگر چیزیں اس کے اندر شامل ہیں اس کی دلیل حضرت عمرو بن عاص کی روایت ہے۔ وہ غزوہ ذات السلاسل کا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

احتلمت فی لیلۃ باردۃ	ایک رات کڑاکے کی سردی پڑ رہی
شدیدۃ البرد، فاشفقت	تھی اور مجھے احتلام ہو گیا۔ یہ سوچ کر
إن اغتسلت ان اھلک فتیممت	کہ اگر میں غسل کروں گا تو موت کا خطرہ
ثم صلیت باصحابی صلاۃ	ہے میں نے تیمم کر لیا اور اپنے ساتھیوں
الصبح، فلما قدمنا علی	کو صبح کی نماز پڑھائی جب ہم وہاں سے
رسول اللہ ﷺ ذکروا ذلک	واپس ہوئے اور اس کا تذکرہ نبی کریم ﷺ
لہ، فقال: یا عمرو صلیت	کی خدمت میں کیا گیا تو آپ نے پوچھا
باصحابک وانت جنب؟ فقلت:	کہ اے عمرو کیا تو نے اپنے ساتھیوں کو
ذکرت قول اللہ تعالیٰ: ولا	حالتِ جنابت میں نماز پڑھائی تھی میں نے
تقتلوا انفسکم ان اللہ کان	فرمایا کہ اے اللہ کے رسول مجھے اس
بکم رحیما" النساء آیت ۲۹	موقع پر اللہ تعالیٰ کا یہ کلام "ولا تقتلوا

فتیممت ثم صلیت فضحك	انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما"
رسول اللہ ﷺ ولم یقل شیئا	یاد آگیا تھا لہٰذا میں نے تیمم کی اور نماز ادا کی
(رواہ احمد و ابوداؤد)	اس پر نبی کریم ﷺ مسکرائے اور آپ نے کچھ نہیں کہا۔

اسی طرح شریعت نے قطعاً اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو عمداً قتل کرے کیونکہ کوئی بھی فرد جو حلقۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے اسلام اس کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے البتہ کچھ صورتیں ایسی ہیں جب ایک مسلمان کا خون حلال ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

ومن یقتل مؤمنا متعمدا	وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل
فجزاؤہ جھنم خالدا فیھا	کرے تو اس کی جزا جہنم ہے جس میں وہ
(سورۃ النسا: ۹۳)	ہمیشہ رہے گا۔

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

ولا یقتلون النفس التی حرم	(اللہ کے نیک بندے) اس کی حرام کی
اللہ الا بالحق (الفرقان: ۶۸)	ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے۔

اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسرے کو قتل کرنے کو کفر سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

لا ترجعوا بعدی کفارا،	میری وفات کے بعد کافر مت ہو جانا
یضرب بعضکم رقاب بعض	کہ تم ایک دوسرے کی گردن مارنے
(رواہ البخاری)	لگو۔

صحیح بخاری میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اکبر الکبائر: الاشراك	کبیرہ گناہوں میں بڑے گناہ یہ ہیں
باللہ وقتل النفس، وعقوق	خدا کی الوہیت میں کسی کو شریک ٹھہرانا،
الوالدین (رواہ البخاری)	مسلمان کا قتل کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔

لیکن مذکورہ بالا حکم کے اندر دو صورتیں شامل نہیں ہیں:۔

(۱) قتل خطا:۔ یعنی وہ قتل جو کسی غلط فہمی کے نتیجہ میں ہو گیا ہو ایسی صورت میں قاتل کے ذمہ صرف کفارہ اور دیت کی ادائیگی لازم ہوگی اسے قتل نہیں کیا جائے گا۔

(۲) قتل حق: اسلام کی نگاہ میں جو امور موجب قتل ہیں اگر کوئی مسلمان ان کا

ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا قتل کرنا شرعاً درست ہے اس کی دلیل حسب ذیل روایت ہے:۔

عن عبد اللہ بن مسعودؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ: لایحل دم امری مسلم یشہد أن لا الٰہ الا اللہ، وانی رسول اللہ الا باحدی ثلاث: النفس بالنفس، والثیب الزانی، والمارق من الدین التارک للجماعۃ (رواہ البخاری)	حضرت عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک مسلمان جو شہادت دیتا ہو کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اس کا رسول ہوں تو اس کا خون حلال نہیں ہے مگر صرف تین باتوں میں (۱) اس نے کسی مسلمان کا قتل کیا ہو تو قصاص میں اسے بھی قتل کر دیا جائیگا۔ (۲) اس نے شادی شدہ ہونے کے بعد کسی عورت کے ساتھ زنا کیا ہو (۳) وہ اسلام لانے کے بعد مرتد ہو جائے۔

ظلم وزیادتی کی وہ تمام صورتیں خواہ اس کا ارتکاب مسلمان کے ساتھ ہو یا غیر مسلم کے ساتھ یکساں طور پر حرام ہیں اور فریق مخالف کے ساتھ اس سلسلے میں امتیاز برتنا کسی بھی صورت میں صحیح نہیں خواہ جہاد کا زمانہ ہی کیوں نہ ہو اور دونوں آپس میں برسرِ پیکار ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:۔

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا (سورۃ البقرہ: ۱۹۰)	اور راہِ خدا میں ان لوگوں کے خلاف قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں لیکن حد اعتدال سے آگے نہ بڑھو۔

اس کا مطلب ہے کہ حالت جنگ میں بھی عدل و انصاف کا دامن نہ چھوڑو اور حد سے آگے مت بڑھو۔ دشمن کی لاشوں کا مثلہ مت کرو، عورتوں، معصوم بچوں اور بیکار ونااہل بوڑھوں کو قتل کرنے سے گریز کرو۔ پادریوں، گرنتھیوں اور راہبوں کو ہلاک مت کرو اور صرف انھیں سے جنگ کرو جو تمہارے مقابلہ میں آتے ہیں۔ حضرت بریدہؓ کی روایت ہے۔

ان رسول اللہ ﷺ یقول "اغزوا فی سبیل اللہ، قاتلوا من کفر باللہ، اغزوا	نبی کریمؐ فرماتے تھے "اللہ کے راستہ میں جنگ کرو۔ منکرین خدا سے قتال کرو۔ جہاد کرو لیکن بدعہدی اور خیانت سے

ولا تغلوا ولا تغدروا ولا تمثلوا ولا تقتلوا الولید ولا اصحاب الصوامع (رواہ مسلم)

بچو نعش کو مثلہ نہ کرو۔ بچوں کو قتل کرو نہ پادریوں وگرجا نشینوں کو۔

زمانہ جنگ میں جب اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ دوران جنگ فریق مخالف کے ساتھ حد سے تجاوز نہ کیا جائے اور بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے تو اس سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ امن و آشتی کے زمانے میں اس کی تعلیمات کیا ہوں گی اور اس نے مسلمانوں کی کس طرح رہنمائی کی ہوگی۔

اہل عرب کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قول "ولا تعتدوا" کا مفعول یا متعلق محذوف ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ نہی عام ہے اور علی الاطلاق حد سے تجاوز کرنے سے روکا گیا ہے یعنی کسی کے ساتھ بھی حد سے تجاوز نہ کرو اور اعتدار کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز پر اکتفا کیا جاسکتا ہے اس سے آگے بڑھ جانا اور عدوان خواہ نفس کے ساتھ ہو یا غیر نفس کے ساتھ، کم ہو یا زیادہ سب کا حکم یکساں ہے اور سب حرمت میں برابر ہیں مثلاً بنا کسی مصلحت کے جانداروں کا قتل کرنا، درختوں کا کاٹنا یا نذر آتش کرنا وغیرہ۔

اور جب اسلام نے غیر مسلم ذمی کافر کے ساتھ ظلم و زیادتی کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے تو پھر کسی مسلمان کے ساتھ زیادتی کو کیسے گوارا کرسکتا ہے لہٰذا اسلام کی نظر میں کسی مسلمان کے ساتھ ظلم و زیادتی کافر کی بہ نسبت عظیم تر گناہ ہے بلکہ اسلام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی ہے کہ ایک مسلمان دوسرے کو قول، فعل یا نظر سے تکلیف پہونچائے حدیث شریف میں ہے:۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ (متفق علیہ)

کامل مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔

اور ایک دوسری روایت میں ہے:

لا یحل لمسلم ان ینظر الی اخیہ بنظر یؤذیہ (رواہ ابن المبارک)

ایک مسلمان کے لیے ناجائز ہے کہ وہ اپنے بھائی کو تکلیف دہ نظروں سے دیکھے۔

ایک اور روایت میں ہے:

لا یحل لمسلم أن یروع مسلما (رواہ احمد وابوداؤد والطبرانی)

کسی مسلمان کو ڈرانا۔ دھمکانا اور خوف دلانا کسی مسلمان کے لیے درست نہیں ہے۔

اس طرح کی بہت سی روایتیں ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ کسی مسلمان کو تکلیف پہونچانا حرام ہے اس سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے کسی عضو کو کاٹنے یا نکالنے کی شریعت کیسے اجازت دے سکتی ہے۔ یہاں ہماری بحث کا موضوع یہی ہے۔

شریعت نے انسان کے اندر کسی بھی طرح کے تصرف کی اجازت نہیں دی ہے خواہ تصرف کا عمل اس کی زندگی میں ہو یا موت کے بعد۔ تصرف مجسم انسان کو فروخت کرنے کی صورت میں ہو یا اس کے کسی عضو کو فروخت کرنے کی شکل میں۔ غرض یہ کہ تصرف کی کوئی بھی قسم کسی بھی طرح عمل میں لائی جائے بہر حال ناجائز و حرام ہے اور اس طرح کی کوئی بھی بیع شرعاً منعقد نہیں ہوگی بلکہ وہ سراسر باطل ہے۔ دلیل مندرجہ ذیل روایت ہے۔

عن ابی ھریرۃ عن النبیؐ قال: قال اللہ تعالیٰ: ثلاثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ: رجل اعطی بی ثم غدر، رجل باع حرا فاکل ثمنہ ورجل استاجر اجیرا فاستوفی منہ ولم یعطہ اجرہ (رواہ احمد والبخاری)

ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا "اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ تین شخص وہ ہیں کہ قیامت کے دن میں ان کا حریف ہوں گا۔ ایک وہ شخص جو میرا نام لے کر کسی سے عہد کرے یا پناہ دے پھر دھوکا دے۔ دوسرا وہ شخص جس نے کسی آزاد انسان کو فروخت کر دیا اور اس کی قیمت کھا گیا۔ تیسرا وہ شخص جس نے کسی کو اجرت پر رکھا اور اس سے بھرپور کام لیا لیکن اس کی مزدوری نہیں ادا کی۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آزاد کی بیع و شرا حرام ہے اور آزاد کا فروخت کنندہ ایک عظیم گناہ کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ تمام آزاد انسان خدا کی ملکیت ہیں اور آزاد کا فروخت کرنے والا غاصب کے مثل ہے جو اللہ کے ایک ایسے بندہ کو غصب کرنے کا سزاوار ہوا ہے جس کے اوپر خدا کے سوا کسی کا کوئی حق نہیں ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ روز قیامت غاصب

کے خلاف ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ آزاد کے بیع کے عدم جواز کے سلسلے میں فقہاء کے مابین کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا ہے ابن منذر کا کہنا ہے کہ تمام فقہاء کا اجماع ہے کہ آزاد کی بیع و شراء باطل ہے۔

اور بیع کے ناجائز ہونے کی وجہ فقہاء یہ بتلاتے ہیں کہ آزاد یا اس کا عضو مال نہیں ہوتا ہے جبکہ تمام فقہاء کے نزدیک متفقہ طور پر بیع کے صحیح ہونے کے لیے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ محلِ بیع تعاقد کو قبول کرتا ہو جس کا مطلب ہے کہ مبیع مال ہو اس کی قیمت ہو ملکیت ہو اور اس سے انتفاع جائز ہو۔

اس کے برخلاف ہم بخوبی واقف ہیں کہ انسان من حیث المجموع کسی کی ملکیت نہیں ہوتا ہے کیونکہ صرف اموال اور اشیاء ہی حقوق اور بیع و شراء کا محل ہوتی ہیں اور ان کے اوپر ملکیت وغیرہ کے احکام جاری ہوتے ہیں اور انسان بقول سرخسی "مال کا مالک ہوتا ہے مملوک نہیں ہوا کرتا اور اس کے مال و مالک مال ہونے کے مابین مغائرت پائی جاتی ہے"

علامہ کاشانی کے بقول گرچہ حنفیہ نے اطراف انسان ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان، ناک اور اس طرح کے دیگر اعضاء کو مال کے مشابہ قرار دیا ہے یعنی ان کے ساتھ مال جیسا معاملہ کیا جاسکتا ہے (بدائع الصنائع) لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت وہ مال ہیں یا مالیت کے درجہ میں ہیں بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اگر کسی سے بسبب خاص قصاص کا حکم ساقط ہو جاتا ہے تو اس کا تاوان مال اور دیت کے ذریعہ ادا کیا جائے گا جیسا کہ مقتول کے اولیاء قاتل کو معاف کر دیں یا جب ہاتھ کاٹنے کا حکم ہو اور قاطع طبیب کے علاوہ کوئی غیر ہو تو قصاص کے بجائے دیت ادا کی جائے گی کیونکہ یہاں قطع ید کے حکم میں ایک شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں شبہ حقیقت کے درجہ کو پہونچ جاتا ہے لہٰذا قصاص ساقط ہو جائے گا لیکن تاوان بہر حال واجب الادا ہوگا کیونکہ شبہ کی بنیاد پر قصاص کا سقوط مال کے وجوب میں مانع نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ انسان اور اس کا کوئی بھی عضو خرید و فروخت کا محل نہیں ہو سکتا اور یہ چیز تمام فقہاء کے نزدیک ثابت و مسلّم بھی ہے لیکن اس حکم سے مرضعہ (دایہ) کے دودھ کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے حالانکہ اگر دیکھا جائے تو اسے بھی شرعاً درست نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ دودھ بھی مرضع کا جزء ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود عقد رضاعت جائز ہے اور اس کی بیع و شراء

کی جا سکتی ہے اور اس کا سبب جواز بچہ کی ضرورت اور استحسان ہے۔ کیونکہ اس کو بھی دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے جس کا حصول محض دودھ کی غذا سے ہی ممکن ہے اور اس کا یہ حق انسان کی کرامت وعظمت سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری ہے۔ کسی انسانی زندگی کی حفاظت معنوی اعتبار سے بھی مقدم ہوا کرتی ہے چونکہ اس سے ایک ذات کی بقا کا مسئلہ وابستہ ہے اس لیے شریعت میں ضرورتاً عقد رضاعت جائز ہے۔

فقہاء کے یہاں رضاعت اجارہ کی طرح ہے جس میں مرضعہ بچہ کو دودھ پلانے کے بدلہ اجرت کی مستحق ہوتی ہے۔ فقہی قیاس کا تقاضہ ہے کہ یہ بیع ناجائز ہو کیوں کہ بیع ایک شئے دودھ کے استہلاک (صرف کرنے) کی ہو رہی ہے اور اجرت شی کے بجائے منفعت کی دی جا رہی ہے لیکن فقہاء نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ بیع کا اصل مقصد استہلاکِ لبن (دودھ کا خرچ کرنا) نہیں ہوتا ہے بلکہ مقصد بچہ کی خدمت اور اس کو دودھ پلانا ہوتا ہے جس کا لازمی نتیجہ دودھ کا استہلاک ہے لہٰذا یہ خدمت کے تابع ہے اس لیے جائز ہے۔ بہت سے ایسے امور ہیں جو اصلاً جائز نہیں ہوتے ہیں لیکن کسی چیز کے تابع ہو کر ان کی بیع درست ہو جاتی ہے یہی حال یہاں مرضعہ کے دودھ کا بھی ہے کہ اس کا مستقلاً بیع کرنا درست نہیں ہے لیکن تبعاً جائز ہے۔

یہ استثناء بطور استحسان ہے جس کی دلیل مندرجہ ذیل آیت ہے :۔

فان ارضعن لکم فآتوھن اجورھن (سورۃ الطلاق : ۶۰)	اگر وہ تمہارے لیے (بچے کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انھیں دو۔

مردہ انسان کے اعضاء سے علاج

انسانی کرامت وعظمت اور تقدس کی بنیاد پر صرف حنفی فقہاء کا ہی نہیں بلکہ جمہور فقہاء کا کہنا ہے کہ انسان خواہ زندہ ہو یا مردہ، ضرورت علاج کی ہو یا کوئی اور، بہر حال کسی بھی صورت میں اعضاء انسان سے انتفاع جائز نہیں ہے جبکہ اگر ضرورت ہو تو فقہاء نے اس بات کی گنجائش رکھی ہے کہ ایک انسان علاج ومعالجہ کے لیے دیگر حیوانات کے اعضاء اور ہڈیوں کا استعمال کر سکتا ہے۔ شریعت کی نظر میں اس میں کوئی قباحت نہیں ہے قطع نظر اس کے کہ جانور زندہ ہو یا مردہ، مذبوح ہو یا غیر مذبوح لیکن خنزیر اس حکم کے اندر نہیں آتا کیونکہ وہ نجس عین ہوتا ہے (الفتاوی الہندیۃ الطبعۃ الثالثۃ)

فقہاء نے "ضرورت" کی تعریف یہ کی ہے کہ آدمی کسی ایسی مصیبت میں گرفتار ہو جائے جس سے بچ نکلنا اس وقت تک ممکن نہ ہو جب تک کہ وہ کسی حرام شئے کا استعمال نہ کرے۔

لیکن ملحوظ رہے کہ حنفی فقہاء نے علاج و معالجہ میں مردہ حیوان کے اعضاء سے انتفاع کو مطلق طور پر نہیں جائز قرار دیا ہے بلکہ اس کی چند شرائط ہیں:۔

۱۔ مسلمان طبیب اس کی ضرورت محسوس کرے۔

۲۔ اسے یقین ہو کہ مرض کی شفا صرف اسی سے ہو سکتی ہے۔

۳۔ حلال شئے کے اندر اس کا بدل موجود نہ ہو۔ (الدر المختار)

رہے شوافع تو اس سلسلے میں ان کے یہاں کافی وسعت پائی جاتی ہے۔ ان کے یہاں اضطراری صورت میں مردہ آدمی کا گوشت استعمال کرنا حلال ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ امام نووی نے اس کی علت یہ بتائی ہے کہ چونکہ ایک زندہ انسان تقدس و عظمت میں مردہ سے بڑھا ہوتا ہے (المجموع للنووی) لہذا زندہ کی حرمت و عظمت کو باقی رکھنا زیادہ ضروری ہے بہ نسبت مردہ کے، لہذا اس کے لیے مردہ کا گوشت جائز اور حلال ہے۔ اس کی مثال بالکل اسی طرح ہے کہ ایک مضطر انسان ہے جس کے سامنے مردہ پڑا ہوا ہے اب اس کے پاس صرف دو صورتیں ہیں یا تو وہ مردہ کا گوشت استعمال کر کے اپنی جان بچالے یا پھر اس کی عظمت کی لحاظ میں اس کا گوشت استعمال نہ کرے اور اپنے آپ کو ہلاک کر دے۔ دونوں ہی صورتیں پر از فساد ہیں لیکن چونکہ موت سے پیدا شدہ فساد گوشت کے استعمال سے پیدا ہونے والے فساد سے بڑھ کر ہے اور جہاں یہ صورت ہو وہاں کم فساد والی چیز کو نظر انداز کر دینا ہی اولیٰ ہے تاکہ فساد عظیم سے بچا جاسکے۔

شیرازی اور جمہور شافعیہ سے بالجزم منقول ہے کہ ان کا یہی مسلک ہے جبکہ دارمی کا مسلک اس سلسلے میں مسلم و غیر مسلم کے مابین تفریق پر مبنی ہے ان کا کہنا ہے کہ مردہ اگر کافر ہے تو اس کا کھانا حلال ہے لیکن اگر وہ مسلمان ہے تو اس سلسلے میں دو رائیں ہیں ایک یہ کہ اس کا کھانا جائز ہے اور دوسری یہ کہ اس کا کھانا جائز نہیں ہے۔

اور اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے کہ مضطر ذمی ہے اور مردہ مسلمان ہے تو کیا ذمی کے لیے مسلمان میت کا گوشت کھانا حلال ہوگا؟ اس کی بھی دو صورتیں ہیں ایک صورت میں کھانا حلال ہوگا اور دوسری صورت میں حرام ہوگا۔ جبکہ نووی کا کہنا ہے کہ مسلمان کی عظمت اور تقدس

کی بنیاد پر قیاس یہی کہتا ہے کہ مردہ مسلمان کا گوشت ذمی کے لیے حرام ہے۔

ظاہر ہے کہ دونوں ضرورتیں (یعنی علاج یا مردہ کا گوشت کھانا) ہم مثل اور یکساں ہیں اور ان کے مابین کوئی فرق نہیں ہے بلکہ اول الذکر موخر الذکر کی بہ نسبت زیادہ اہم اور بہتر ہے کیونکہ دوسری صورت میں مضطر انسان اپنی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے مردہ کا گوشت کھاتا ہے اور اس طرح سے اس کو ضائع و برباد کرتا ہے گویا اپنی زندگی کی بقا کی خاطر غیر کو ضائع کرتا ہے جو مستحسن نہیں ہے جبکہ پہلی صورت میں مردہ کا عضو کسی ضرورت مند انسان کے جسم میں جوڑ دیا جاتا ہے جس سے اس کو ایک نئی زندگی مل جاتی ہے اس طرح مردہ کے عضو سے قریب المرگ کا نئی زندگی حاصل کر لینا گویا خود مردہ کا زندہ ہو جانا اور اس کو باقی رکھنا ہے لہٰذا یہ زیادہ بہتر ہے۔

زندہ انسان کے اعضاء سے انتفاع کا حکم

شوافع کا اس سلسلے میں کہنا ہے کہ اس کی چار شکلیں ہو سکتی ہیں:۔

۱۔ پہلی صورت یہ ہے کہ وہ شخص جس کا عضو یا گوشت قطع کیا جا رہا ہے مباح الدم ہو مثلاً حربی اور مرتد۔ ایسی صورت میں مضطر کے لیے ان دونوں کا قتل کرنا اور ان کے گوشت کا استعمال کرنا جائز ہے اور بلا اختلاف تمام فقہاء کا مسلک یہی ہے۔

۲۔ دوسری شکل یہ ہو سکتی ہے کہ وہ شخص جس کا عضو یا گوشت قطع کیا جا رہا ہے فی نفسہٖ معصوم ہو لیکن اس نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب کیا ہو جس کی سزا شریعت نے قتل مقرر کی ہو لہٰذا اس کا خون حلال ہو گیا ہو مثلاً شادی شدہ زانی، محارب (وہ شخص جو امام عادل کے خلاف بغاوت کر دے) اور تارک نماز۔ کیا ایک مضطر کے لیے ان کا قتل کرنا اور ان کا گوشت کھانا جائز ہے نووی نے لکھا ہے کہ اس کے بارے میں دو رائیں ہو سکتی ہیں: ایک جواز کی اور دوسری حرمت کی لیکن صحیح یہی ہے کہ ان کا قتل کرنا اور گوشت کھانا درست ہے کیونکہ انھیں قتل نہ کرنے اور سلطان کے حوالہ کر دینے کا حکم محض اس لیے ہے تاکہ اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے اور اس کی اطلاع و اذن کے بغیر حد نہ جاری کی جائے لیکن درحقیقت یہ کوئی عذر نہیں ہے اور نہ اس سے حرمت ثابت ہوگی خصوصاً جبکہ اضطرار ثابت ہو چکا ہو۔ لہٰذا مضطر کے لیے ان کا قتل کرنا اور گوشت کھانا حلال ہے۔

(۳) تیسری شکل یہ ہے کہ وہ شخص جس کا گوشت یا کوئی عضو قطع کیا جا رہا ہے وہ عمداً کسی

کا قاتل ہے جس سے اس کا خون حلال ہوگیا ہے اور عضو قطع کرنے والا مقتول کا ولی ہے اس طرح سے قاطع کا اس شخص کے اوپر حق بھی ہے ایسی صورت میں نووی کا کہنا ہے کہ بطور قصاص اس کا قتل جائز ہے اور اس کے گوشت کا استعمال بھی درست ہے اور یہ ضروری نہیں کہ حاکم وقت وہاں پر وقت قتل موجود ہو۔

۴۔ چوتھی صورت اس کی یہ بنتی ہے کہ وہ شخص جس کا عضو یا گوشت قطع کیا جا رہا ہے علی الاطلاق معصوم ہو اس کے اوپر کسی طرح کا کوئی بھی جرم ثابت نہ ہو مثلاً ذمی، معاہد اور مستامن، ان کا قتل کرنا بلا اختلاف سب ہی فقہاء کے نزدیک حرام ہے۔

ان مذکورہ بالا چاروں صورتوں کا تعلق محض مضطر کی ذات تک محدود تھا اب ان کا تجزیہ ایک دوسری حیثیت سے کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اگر ضرورت گوشت کھانے کی طرح علاج کی درپیش ہو اور دونوں کی نوعیتیں ایک ہوں تو کیا ان کا حکم وہی باقی رہتا ہے جو اوپر مذکور ہوا یا کوئی دوسرا۔

پہلی صورت : اس قسم کے تحت جتنے بھی افراد مختلف نوعیت کے آتے ہیں ان کے سلسلے میں فقہاء کا کہنا ہے کہ ان میں سے صرف حربی اور مرتد ہی کے اجسام سے کسی عضو کا نکالنا جائز ہوگا اس کی وجہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ان کی دشمنی ہے چونکہ حربی ہمیشہ قتل و غارت گری میں مشغول رہتا ہے اور شر و فساد کا ذریعہ ہوتا ہے جبکہ مرتد اسلام اور مسلمانوں کی جماعت سے نکل جاتا ہے اور دشمنان اسلام کی صفوں میں آجاتا ہے لہٰذا ضرورت علاج کے تحت صرف انھیں کا عضو نکالا جا سکتا ہے جبکہ اس صورت کے اندر شامل اور دیگر اقسام کے افراد اس سے مستثنیٰ ہوں گے۔

دوسری صورت : اس سلسلے میں فقہاء کا کہنا ہے کہ اس کے اندر شامل افراد یعنی شادی شدہ زانی، محارب اور تارک نماز کے اجسام سے عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتلائی ہے کہ چونکہ ان کی سزا اور حد قتل ہے جو کہ شریعت کی عائد کردہ ہے لہٰذا ان کا قتل شریعت کا حق ہے اس کے برعکس ان کے اجسام میں سے کسی عضو کا نکال لینا حق شریعت یا حد کے ساتھ زیادتی ہے لہٰذا ان کے جسم سے کسی عضو کا نکالنا درست نہیں ہاں ان کی اجازت سے جواز کی صورت نکل سکتی ہے۔

تیسری شکل : اس سلسلے میں فقہاء کی رائے یہ ہے کہ عمداً قتل کرنے والے

کے جسم سے مطلق طور پر عضو کا نکالنا درست نہیں ہے البتہ اگر عضو کے نکالنے سے اس کے جسم کا مثلہ نہیں ہوتا ہے تو نکالنے کی اجازت دی جا سکتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مثلہ شریعت کے اندر ممنوع ہے نیز مشروع صرف اس کا قتل کرنا ہے مزید براں شارع نے قتل میں احسان کا حکم بھی دیا ہے حدیث میں ہے:۔

ان اللہ کتب الاحسان علی کل	بلاشبہ اللہ نے احسان کو ہر چیز پر واجب
شیٔ، فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ	کیا ہے لہٰذا جب تمہارا ارادہ کسی چیز کو
(رواہ الامام احمد و مسلم)	قتل کرنا ہو تو تم احسان سے کام لو۔

لہٰذا اگر اس کے عضو کے نکالنے سے مثلہ نہ ہوتا ہو تو اس کے عضو کے نکالنے اور اس سے انتفاع میں کوئی حرج نہیں ہے۔

مضطر کا انتفاع اپنی ذات سے

کیا مضطر کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ خود اپنے بدن سے نکالے ہوئے کسی عضو کا استعمال اپنی بقاء کے لیے کرے؟

اس مسئلہ کی بابت امام نووی فرماتے ہیں کہ اس کی دو صورتیں ہیں:۔

پہلی صورت جواز کی ہے اور یہ قول ابو اسحاق کا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے جسم کا کوئی عضو استعمال کرتا ہے اور دوبارہ زندگی مل جاتی ہے تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور اس کی اجازت ہے اور اس کی مثال ایسے ہی ہے کہ جب کسی انسان کے جسم کا کوئی عضو سڑ جاتا ہے جس سے اس کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے ایسی صورت میں اس عضو کو جسم سے نکال دیا جاتا ہے اور ایسا مریض کی زندگی کو بچانے کے لیے کیا جاتا ہے لہٰذا مضطر کے لیے بھی یہ جائز ہے کہ وہ اپنے جزو بدن کا استعمال کر کے اپنے آپ کو ہلاکت سے بچالے۔

دوسری صورت عدم جواز کی ہے اس کے قائل بعض شافعیہ ہیں ان کا کہنا ہے کہ مضطر اپنے جسم کا عضو کاٹ کر جس چیز سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے اس سے چھٹکارا کی امید تو نہیں ہے البتہ مزید اس کے خطرہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے اور اس کی یہ تدبیر الٹے اس کے گلے کا پھندا بن سکتی ہے۔ لہٰذا ایسا کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا دونوں صورتوں سے قطع نظر اس پر اس نوعیت سے غور کرنا زیادہ صحیح

معلوم ہوتا ہے اگر اس کے بغیر انسان کا زندہ رہنا مشکل ہے اور اس کے نکالنے سے موت کا وقوع یقینی ہے یا اگر انسان مرتا نہیں ہے لیکن بمثل مردہ ہوجاتا ہے ایسی صورت میں اس طرح کے عضو کا نکالنا درست نہیں ہے کیونکہ یہ خودکشی کے مانند ہے۔ اسلام نے اسے حرام قرار دیا ہے۔ حدیث میں ہے:۔

من تردی من جبل	جس کسی نے پہاڑ سے گر کر خودکشی
فقتل نفسہ، فھو فی نار	کرلی تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں
جہنم خالدا مخلدا فیہا	وہ ہمیشہ اپنے نفس کو یونہی ہلاک کرتا رہے گا
ابدا ومن تحسی سما فقتل	اور جس نے زہر پی کر اپنی جان خود دے
نفسہ، فسمہ فی یدہ یتحساہ	دی تو ایسا شخص جہنم میں ہوگا اس حال
فی نار جہنم، خالدا فیہا	میں کہ زہر کا پیالہ اس کے ہاتھ میں ہوگا
ابدا، ومن قتل نفسہ	جس سے وہ پی رہا ہوگا اور جس نے کسی
بحدیدۃ فھو یتوجأ بہا	آلے کے ذریعہ اپنے کو ہلاک کرلیا تو وہ
فی بطنہ، فی نار جہنم خالدا	بھی ہمیشہ کے لیے جہنم میں ہوگا اور اسی
فیہا ابدا۔ (احمد، مسلم، ترمذی، نسائی، دارمی)	آلہ کے ذریعہ اپنے پیٹ کو کوٹ رہا ہوگا۔

لیکن اگر نکالے جانے والے عضو کی حیثیت یہ نہیں ہے بلکہ انسان اس کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہے اور تجربہ بتلاتا ہے کہ اس کے نکالنے سے انسان قطعی طور پر موت کا شکار نہیں ہوگا یا ماہر طبیب کا کہنا ہے کہ اس سے موت نہیں ہوگی جیسا کہ اگر انسانی جسم سے ہاتھ انگلیاں اور گردے کو نکال دیا جائے تو انسان کی موت نہیں ہوتی ہے اس صورت میں اس طرح کے عضو کے نکالنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن ایسا کرنا صرف دو صورتوں میں جائز ہوگا:۔

۱۔ اس کے علاوہ کوئی دوسری شی اس کی جگہ کام نہ دے سکتی ہو۔

۲۔ اس سے ہلاکت کا اندیشہ نہ ہو۔

دوسرے کے علاج کے لیے زندہ انسان کے اعضاء کا استعمال

اس سلسلے میں امام نووی نے صراحت کی ہے کہ:۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ: امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز سے علم رخصت ہوجاتا

۱۔کسی انسان کے لیے اپنی بقاء زیست کی خاطر کسی دوسرے معصوم انسان کے عضو کو استعمال کرنا بالاتفاق جائز نہیں ہے۔

۲۔کسی دوسرے شخص کے لیے بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے جسم کا کوئی عضو کاٹ کر مضطر کو دے دے اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے، اس کی صراحت امام الحرمین اور دیگر اصحاب شوافع نے کی ہے (المجموع)

اسی طرح حنفیہ کا کہنا ہے کہ ایک مضطر کے لیے دوسرے مضطر کا کھانا (FOOD) یا اس کے بدن کا کوئی حصہ کھانا جائز نہیں ہے۔ اس کی علت انھوں نے یہ بتلائی ہے کہ ایک ضرر کا ازالہ دوسرے ضرر سے جائز نہیں ہے (الاشباہ والنظائر لابن نجیم)

زندہ انسان کا اپنے کسی عضو کو دوسرے کے علاج کے لیے دینا

یہ ایثار اور احسان کی ایک صورت ہے جس کی ترغیب قرآن میں دی گئی ہے ارشاد باری ہے:۔

ومن احیاھا فکانما احیا	اور جو کسی نفس کے لیے زندگی کا باعث بنا
الناس جمیعا	تو گویا اس نے پوری کائنات انسانیت
(المائدہ: ۳۲)	کو زندگی عطا کردی۔

اس کے برعکس حنفیہ کے ظاہری نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ اگر عضو کو نکال کر خود اسی شخص کا علاج مقصود ہو تو جائز ہے لیکن اگر مقصد دوسرے مضطر کے لیے اس کا استعمال ہے تو درست نہیں ہوگا (رد المحتار علی الدر المختار)

علامہ ابن عابدین کہتے ہیں کہ اگر ایک شخص دوسرے سے کہے کہ میرا ہاتھ کاٹو اور کھاؤ تو دوسرے شخص کے لیے ایسا کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ انسان بہرحال مکرم و معظم ہے اور اس کا گوشت بہر صورت مباح نہیں ہے خواہ اضطراری کی صورت کیوں نہ ہو۔ (رد المحتار علی الدر المختار)

یہی وجہ ہے کہ حنفیہ کے یہاں بوقت اضطرار انسان کے گوشت کا استعمال مطلق طور پر حرام ہے ایک انسان نہ خود اپنا گوشت استعمال کرسکتا ہے اور نہ دوسرے کو دے سکتا ہے اور اس کی وجہ انسان کی کرامت و عظمت ہے۔

اسی طرح ان کے یہاں علاج کے سوا کسی اور مقصد کی خاطر انسانی اعضاء میں سے

کسی عضو کا نکالنا درست نہیں ہے اور اس کی بھی وجہ کرامت ہے۔

لیکن اگر کسی فرد کے علاج کے لیے خود اس کے عضو کا نکالا جانا ضروری ہے تو حنفیہ نے بوقت ضرورت اس کی اجازت دی ہے جیسا کہ اس سے قبل ان کی دلیل میں یہ بات گذر چکی ہے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے میں اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے۔ اس کا واضح مطلب ہے کہ کسی بیمار انسان کے لیے کسی دوسرے صحت مند انسان کے عضو کو نکالنا صحیح نہیں کیونکہ جس ضرورت کے تحت یعنی بیمار کے ہلاک ہونے کا خوف ـــــ عضو کو نکالا گیا تھا وہ یہاں نہیں پائی جاتی ہے۔ بلکہ مزید برآں معطی کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو سکتا ہے لہٰذا دوسرے کی خاطر عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے لیکن اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کسی انسان کے عضو کو اس کے علاج کی خاطر نکالے جانے کو حق بجانب و درست قرار دیتے ہیں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ عضو نہ نکالا جائے تو اس کی ہلاکت کا اندیشہ ہے تو پھر ایک انسان کے علاج کے لیے کسی غیر کے عضو کو نکالنے کی اجازت آپ کیوں نہیں دیتے؟ جبکہ اس کی ہلاکت کا بھی اندیشہ ہے اور دونوں کی ہلاکت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

مزید برآں حنفیہ اور غیر حنفیہ کا یہ بھی قول ہے کہ اگر کوئی شخص ڈوب رہا ہے اور ہلاکت کے بالکل قریب ہے اور جائے وقوع پر کوئی ایسا شخص موجود ہے جو اس کے بچانے پر قادر ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زندگی کی حفاظت کرے لیکن اگر قادر شخص اپنی ذمہ داری سے غفلت برتتا ہے اور ڈوبنے والا شخص ہلاک ہو جاتا ہے تو اس کا گناہ اس کو ملے گا بلکہ بعض حنابلہ کا یہاں تک کہنا ہے کہ اس پر دیت کی ادائیگی لازم ہے۔

پھر آخر کون سی چیز ہے جو معطی سے دوسرے کے علاج کی خاطر عضو کے نکالنے کو جائز قرار دینے میں مانع ہے جبکہ اسے معطی کی مرضی سے نکالا جا رہا ہو مثلاً وہ اپنی زندگی ہی میں ہبہ کر دے یا بعد وفات اس کے نکالنے کی وصیت کر دی ہو اور وہ معاوضہ کا طالب بھی نہیں ہے اور وہ تمام شروط بھی پائی جاتی ہیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ حنفیہ نے انسان کا گوشت کھانا اس کی کرامت کی وجہ سے اضطرار کی صورت میں بھی حلال نہیں قرار دیا ہے تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ حنفیہ نے عدم جواز کا فتویٰ اس بنیاد پر دیا ہے کہ گوشت کھانے میں تضییع اور اتلاف لازم آتا ہے جو کہ انسان کی اہانت ہے۔ جہاں تک دوسرے کے لیے عضو کے نکالنے کا مسئلہ ہے

اس کے اندر نہ تو انسانی اعضاء کا اتلاف ہے اور نہ اس کی توہین ہی ہے۔ پھر کس بنیاد پر اس کو ناجائز کہا جا سکتا ہے بلکہ نکالے ہوئے عضو کی بقا کا ذریعہ ہے جب تک اس کے ذریعہ علاج کردہ شخص زندہ رہتا ہے اور یہ کام اہانت کا نہیں ہے بلکہ یہ دوسرے کی مدد اور اس کا تعاون ہے اس کے ذریعہ دوسرے شخص کو نئی زندگی حاصل ہوتی ہے اور شریعت میں کہیں بھی اس چیز سے منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کی رغبت دلائی گئی ہے اور اس کو مستحسن فعل قرار دیا گیا ہے۔

اس کے باوجود ضروری ہے کہ کسی انسان کا عضو نکالتے وقت مندرجہ ذیل شرائط پائی جائیں

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ معطی نے مطلق طور پر اپنے عضو کو نکالنے کی اجازت دے دی ہو بغیر اجازت عضو کا نکالنا حرام ہے اور اگر عضو نکالنے کی صورت میں اس کی وفات ہو جاتی ہے یا اس کا کوئی عضو بیکار ہو جاتا ہے ایسی صورت میں عضو نکالنے والے پر ضروری ہوگا کہ وہ دیت ادا کرے اور اگر بالقصد اس نے ایسا کیا ہے تو قصاص واجب ہوگا۔

(۲) دوسری شرط یہ ہے کہ معطی عاقل، بالغ ہو، فیصلہ کرنے میں خود مختار ہو اور اس کا اپنا فیصلہ ہو کوئی خارجی دباؤ اس پر نہ ہو اس سلسلے میں اسے تصرف کا حق بھی حاصل ہے کیونکہ یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے جو اس کی اپنی ذات تک محدود ہے اور اسے اپنی ذات کے اندر شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے مکمل تصرف کا حق حاصل ہے۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ معطی کی نیت خالص ہو اور اس کا مقصد محض راہ خدا میں اپنے عضو کو صدقہ کر دینا ہو اس کا بدل اسے مطلوب نہ ہو تمام فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ انسان اور اس کے عضو کی بیع و شراء جائز نہیں ہے کیونکہ انسان ایک محترم و مکرم ہستی ہے جبکہ خرید و فروخت اشیاء کے توہین کی علامت ہیں۔ علامہ کاشانی کہتے ہیں کہ "سراپا انسان بشمول اپنے تمام اجزاء و اعضاء مکرم و محترم ہے اور بیع و شراء اس کی کرامت کے منافی ہے اور اس کی تذلیل و تحقیر ہے" (بدائع الصنائع)

(۴) چوتھی شرط یہ ہے کہ عضو ایسا ہو جس کے نکالنے سے معطی ہلاک نہ ہو یا اس کی وجہ سے فالج زدہ نہ ہو جو اس کی دنیوی و دینی ذمہ داریوں کے ادا کرنے میں حارج ہوں۔

(۵) پانچویں شرط یہ ہے کہ عضو کے نکالنے کی اجازت خود معطی نے اپنی زندگی ہی میں یا اس کے ورثاء نے اس کی وفات کے بعد دی ہو۔

(۶) چھٹی شرط یہ ہے کہ عضو کو نکالنے سے نعش کی ہیئت مثلہ جیسی نہ ہو جاتی ہو کیونکہ نبی کریمؐ نے مثلہ کرنے سے روکا ہے اور آپؐ کا فرمان ہے:۔

انکم ستجدون مثلۃ لم آمر بھا (رواہ احمد والبخاری)

بیشک تم لوگ مثلہ کی ہوئی لاشوں کو دیکھو گے جس کا میں نے حکم نہیں دیا ہے۔

(۷) ساتویں شرط یہ ہے کہ عضو کا نکالنا اسی وقت عمل میں لایا جائے جب پوری طرح متحقق ہوجائے کہ معطی کی وفات ہو چکی ہے خصوصاً اس صورت میں جبکہ عضو کا نکالنا ہی اس کی دائمی وحتمی موت کا سبب ہو مثلاً دل اور پھیپھڑے کا نکال لینا۔ یہ شرط اس لیے ہے تاکہ ایک انسان جس کے اندر ابھی زندگی کی رمق باقی ہے اس کو جلدی قتل ہونے سے بچایا جاسکے۔

اور اگر کسی کی حالت بہت ہی نازک ہے اور اس کے بچنے کی قطعاً امید نہیں ہے اور اطباء کا بھی یہی کہنا ہے لیکن فی الواقع ابھی اس کی موت نہیں ہوئی ہے ایسی صورت میں اس کے کسی بھی عضو کا نکالنا جائز نہیں ہے ایسی حالت میں معطی اگر اپنا عضو نکالنے کی اجازت دے دیتا ہے اور اس کی وفات ہوجاتی ہے تو یہ خودکشی ہے اور اگر اس کی اجازت کے بغیر عضو کو نکالا گیا ہے تو یہ ایک نفس کو ناحق قتل کرنے کے مترادف ہے اور دونوں ہی صورتیں ناجائز اور حرام ہیں جبکہ آخری صورت میں فقہاء کے نزدیک تاوان ادا کرنا بھی ضروری ہے۔

(۸) آٹھویں شرط یہ ہے کہ غیر کو بچانے کے لیے معطی کا عضو اسی صورت میں نکالا جائے گا جبکہ اس کی جگہ کوئی بھی حیوانی یا مصنوعی عضو کام نہ دے سکتا ہو اور اس کے بغیر ضرورت کی تکمیل ممکن نہ ہو اور اس کی اجازت محض ضرورت کے ثابت ہونے پر دی گئی ہے۔ کیونکہ اصلاً یہ شی حرام ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

انسانی اعضاء کی خرید وفروخت

جیسا کہ شروع میں آچکا ہے کہ آزاد انسان محل بیع نہیں ہوتا اس لیے اس کی بیع ناجائز ہے لہٰذا اگر انسان یا اس کے کسی بھی عضو کی بیع کی جاتی ہے تو تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ایسی بیع منعقد نہیں ہوگی۔

لیکن اگر کوئی مریض انسانی عضو کا سخت حاجت مند ہے اور مطلوبہ عضو اسے بغیر عوض کے نہیں مل پارہا ہے اور اس کا مصنوعی بدل بھی موجود نہیں ہے اس حالت میں مریض کے لیے عضو کا خریدنا سابقہ شرائط کے ساتھ جائز ہوگا جن کا تذکرہ ابھی معطی سے عضو کے نکالنے کے تحت کیا گیا ہے اور اس کی اجازت محض ضرورت کی رعایت کرتے ہوئے دی گئی ہے

اور مشتری کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے بلکہ تمام تر ذمہ داری بائع کی ہے اور وہی گناہ گار ہوگا۔

اسی طرح کی حالتوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقد فصل لکم ما حرم علیکم الا ما اضطررتم الیہ (الانعام: ١١٩)	حالانکہ جن چیزوں کا استعمال حالت اضطرار کے سوا دوسری تمام حالتوں میں اللہ نے حرام کر دیا ہے ان کی تفصیل وہ تمہیں بتا چکا ہے۔

اور فروعات سے خریدنے کی جواز کا پتہ چلتا ہے گرچہ بیچنے کی حرمت ہے۔ بلکہ حنبلیہ کا یہاں تک کہنا ہے کہ مصحف کی بیع حرام ہے گرچہ اس کا مقصد دین کی کسی ضرورت کی تکمیل ہی کیوں نہ ہو۔

امام احمد کا قول ہے:۔

لا نعلم فی بیع المصحف رخصۃ	مصحف کی بیع کے سلسلے میں مجھے کسی رخصت کا علم نہیں ہے۔

اور عبداللہ بن عمر کا کہنا ہے:۔

وددت ان الایدی تقطع فی بیعہ	مجھے یہ پسند ہے کہ قرآن کی بیع پر ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔

حنبلیہ نے ابن عمرؓ کے مذکورہ قول کی توجیہ یہ کی ہے کہ قرآن کی تعظیم اور اس کی تکریم تمام مسلمانوں پر واجب ہے اور قرآن بیع وشراء سے کہیں بالا و بلند تر ہے اب اگر ایک مسلمان اس کی بیع کرتا ہے تو اس کا واضح مطلب ہے کہ اس کی عظمت کا وہ قائل نہیں ہے اور بیع کے ذریعہ قرآن کے رتبہ و مرتبہ کو گھٹا رہا ہے اس کی تقصیر و توہین کر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ ابن عمرؓ نے ہاتھ کاٹنے کو قرآن کی بیع پر ترجیح دی ہے۔ اس کے برخلاف مصحف کے خریدنے کو انھوں نے جائز قرار دیا ہے۔

اما شراء المصحف فقد نصوا علی انہ لا یکرہ لان الشراء بمثابۃ استنقاذ لہ کشراء الاسیر من المحاربین

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے کہ: امام مالک اور سفیان بن عیینہ نہ ہوتے تو حجاز سے علم رخصت ہو جاتا